مولانا سید علی محمد نقوی

قرآن شناسی

تفسیر سورہ البقرہ

تعارف:

البقرہ قرآن کریم کا طویل ترین سورہ ہے جس کا نام اس سورہ کی بعض آیات سے، جس میں ایک گائے کے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے، لیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورہ میں متعدد مقامات پر اہل یہود کا تذکرہ موجود ہے اور گائے کی پرستش یہودیوں کا ایک مخصوص مشرکانہ عمل تھا اس لئے اس واقعہ کو جائز طور پر زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسی کے مطابق اس سورہ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات ضرور ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ مختلف سوروں کے نام صرف ان کی شناخت کے لئے رکھے گئے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سورے کا اصل موضوع اسی نام کے مطابق ہو۔ سوروں کے یہ نام رسول اکرمؐ نے خود وحی الٰہی کے مطابق معین کیے ہیں۔

یہ سورہ پیغمبرؐ کی مدنی زندگی کے اولین دور میں نازل ہوا۔ اس کا بڑا حصہ ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں نازل ہوا جبکہ اس کی بعض آیتیں بعد میں اور کچھ وفات پیغمبرؐ کے قریب نازل ہوئیں۔

سورہ بقرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جلیل القدر شیعہ مفسر علامہ طبرسی اپنی مشہور تفسیر ''مجمع البیان'' میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم کا کون سا سورہ سب سے بہتر ہے تو آپ نے فرمایا البقرہ۔ پھر سوال کیا گیا کہ (اس کی) کونسی آیت بہتر ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا آیۃ الکرسی۔ اس سورہ مبارکہ کی فضیلت دوسرے سوروں پر ظاہری طور سے اولاً اس کی ہمہ گیری اور ثانیاً آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) کی وجہ سے ثابت ہے۔ اس

میں اللہ کی توحید اور اس کی معرفت کے مخصوص مضامین پنہاں ہیں جنہیں ہم انشاء اللہ آگے زیر بحث لائیں گے۔ اسی سورہ کی اہمیت کے سلسلے میں امام زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں، آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتوں کے ساتھ اس سورہ کی آخری تین آیتوں کی تلاوت کرتا ہے تو گویا کہ وہ ہدایت یافتہ اور امان میں ہے۔

تاریخی پس منظر:

پیغمبرؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد اسلامی تحریک اپنے نئے دور میں داخل ہوئی جہاں کے معاملات ومسائل مکی دور سے بہت مختلف تھے۔ مکی دور میں آنحضرتؐ کا بیشتر وقت مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی عقائد اور اخلاقیات کی تعلیم وتبلیغ میں صرف ہوتا تھا جبکہ ہجرت کے بعد چونکہ مدینے میں ایک چھوٹی سی اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اس لئے خداوند عالم کی جانب سے اب سماجی، اقتصادی اور سیاسی امور سے متعلق بنیادی ہدایات کا نزول شروع ہوا۔

ہجرت سے قبل پیغام اسلام کے مخاطبین اکثر اوقات میں کفار مکہ ہوتے تھے۔ ہجرت کرنے کے بعد آپ نے پایا کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں یہودیوں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ ان اہل یہود کا مذہب رسم ورواج کی خرافات اور وحی الٰہی میں تصرف اور تحریف سے عبارت تھا۔ ان لوگوں نے اور خصوصاً ان کے رہنماؤں نے مذہب کو مادی فوائد کے حصول اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کا ایک ذریعہ قرار دے رکھا تھا۔ اسلامی تحریک کے اس دور میں منافقین کا ایک گروہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے فتنہ پردازی کی غرض سے کلمہ پڑھ کر اپنا نام مسلمانوں میں درج کروالیا تھا جبکہ ان کے قلوب کفر والحاد کی غلاظتوں سے ملوث تھے۔ ان لوگوں نے خفیہ طور پر کفار سے روابط بڑھا رکھے تھے اور ان کی سازباز سے شجر اسلام کو کھوکھلا بنانے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے صرف اسی لئے دائرہ اسلام میں آنا قبول کیا تھا کہ ان کے خاندان کے اکثر افراد مسلمان ہوگئے تھے، یہ لوگ در

اصل اس نئے مذہب کو اپنانے میں متزلزل تھے اور کسی قطعی فیصلے پر ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

سورہ بقر کا موضوع :

اس سورہ کا اصل موضوع اسی سورہ کی ۱۴۰ ویں آیت میں واضح کیا گیا ہے یعنی ''اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر'' انتظام نبوت ، گزشتہ تہذیبوں کے افسانے ، نا قابل تبدیل مشن الہیہ وغیرہ اس کی نشانیاں ہیں جن کا ذکر اللہ نے اس سورہ کی متعدد آیات میں بھی اختصار اور کبھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ سورہ اہل یہود اور ان کی اسلام دشمنی کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں اسلام کے بنیادی اصول اور عقائد کا بیان ہے۔ یہ بنیادی عقاید پانچ ہیں۔ ایمان بالغیب یعنی اللہ، حضرت محمد مصطفیٰ ؐ اور انبیاے ما سبق پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان ، اور ایمان بالآخرۃ ۔عقاید کے بعد اعمال کی منزل میں عبادتوں کا ذکر ہے جو اپنے وسیع مفاہیم میں درحقیقت تمام اوصاف حسنہ اور بالخصوص عشق الٰہی اور انسان دوستی کا سرچشمہ ہے۔

سورہ بقرہ اورسورۃ فاتحہ کے درمیان یہ ایک واضح رابطہ ہے ۔جس طرح سورہ فاتحہ کی آخری آیتوں میں بندہ اپنے رب سے صراط مستقیم کی جانب ہدایت کا سوال کرتا ہے اسی کے جواب میں سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اسکی دعا کو قبولیت کا شرف بخشتے ہوئے اعلان کررہی ہیں '' یہ کتاب، جس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، متقین کے لئے ہدایت ہے'' (آیت ۲)

الف ، لام، میم الٓمٓ (۱:۲)

حروف مقطعات کا بیان:

سورہ بقرہ کی ابتداء تین عربی حروف یعنی ا،ل،م سے ہوتی ہے، ان حروف کو حروف

مقطعات کہا جاتا ہے۔ ان حروف کو ہم نے بغیر ترجمہ کے اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ ان کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس طرح الگ الگ حروف کی شکل میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ حروف مقطعات قرآن کریم کے اٹھائیس ۲۸ سوروں کی ابتداء میں وارد ہوئے ہیں۔ جن حروف سے ملکر یہ حروف مقطعات بنے ہیں ان کی مجموعی تعداد تیرہ ۱۳ ہے، یہ حروف ہیں: ا،ل،م،ص، ر،ک،ح،ی،ع،ط،س،ھ اور ق۔ ان میں سے حرف قٓ کسی سورہ کی ابتداء میں اکیلے صرف ایک مرتبہ آیا ہے جبکہ دوسرے حروف دو یا زیادہ مجموعوں میں مختلف سوروں کی ابتداء میں وارد ہوئے ہیں۔ اکیلے ا،ل،م ہی چھ سوروں یعنی اس سورہ کے علاوہ ۳، ۲۹، ۳۰، ۳۱ اور ۳۲ ویں سورہ کی شروعات میں آیا ہے۔

ان حروف مقطعات کے بارے میں مفسرین اور محققین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اس میں سے اکثر کی حیثیت تخمینے اور اندازے سے زیادہ نہیں ہے۔ ہمیں ان حروف کو غیبی اور عرفانی اشارات ہی سمجھنا چاہئے جن کے معنی ان حروف کو نازل کرنے والے خداؑ اور وحی الٰہی کے سرچشموں سے سیراب ہونے والے راسخون فی العلم کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں عربی شعرا اور خطیب اس طرح کے حروف اپنے اپنے کلام میں عمومی طور پر استعمال کرتے تھے اور یہ اس زمانے کا ایک معروف طریقہ تھا۔ عرب ادباء اور عوام ان حروف مقطعات کے معنی اور مفاہیم سے بخوبی واقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں رسولؐ کے کسی صحابی نے ان حروف کے سلسلے میں کسی شک وشبہ یا اعتراض کا اظہار نہیں کیا اور نہ کسی صحابی رسولؐ نے آنحضرتؐ سے ان حروف کے معنی دریافت کیے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کے عربوں کے نزدیک یہ حروف کسی معمہ کی حیثیت نہ رکھتے تھے، پھر ہوا یہ کہ زمانے اور زبان کی تبدیلی کے ساتھ یہ حروف عربی ادب میں متروک ہوتے چلے گئے اور اب لوگوں کے لئے ان کے معنی کا تعین کرنا مشکل ہوگیا۔ ان ابتدائی علاماتی حروف کو سمجھنا ہمارے امکان کے باہر

ہے۔ اس لئے ہمیں اس کی سعی لاحاصل بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ قرآن انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور قرآن سے سچی ہدایت حاصل کرنا حروف کی اس گتھی سلجھانے پر منحصر نہیں ہے۔ اس طرح ایک عام قاری کو اس مسئلے میں زیادہ غوروفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بحر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ علامتی اور عرفانی حروف لطف الٰہی کے سرچشمے اور علوم الٰہیہ کے خزانے ہیں۔ انکے حقیقی معنی انوار باطنی کے ذریعے ہی ہم پر منکشف ہوسکتے ہیں اسی لئے صوفیائے کرام اور عرفاء نے ان حروف کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اور اسلامی دعاؤں میں لطف و رحمۃ الٰہی کے وسیلے کے طور پر ان حروف کی بہت تکرار ملتی ہے۔

آیت ۲:۲

قرآن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

''یہ کتاب، جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، متقین کے لئے ہدایت ہے''

قرآن کی ماہیت:

اس آیہ کریمہ میں قرآن کو ''الکتاب'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنی اصطلاحات کے مطابق ''کتاب'' یا اسکی جمع ''کتب'' صحیفہ یا مکتوب وحی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس طرح اس لفظ کا استعمال ابتداء ہی میں کرکے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ قرآن از روز اول ایک کتاب ہے کوئی زبانی تعلیم نہیں۔ جبکہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابیں درحقیقت زبانی تعلیمات ہیں جنہیں بعد میں کتابی شکل عطا کی گئی۔ قرآن حکیم کا مختلف مذاہب کے صحیفوں پر یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہ اپنی ابتداء سے ایک مکتوب صحیفہ ہے جسے کتاب ہی کی شکل میں نازل کیا گیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے صحیفے عمومی طور پر مختلف ادوار میں جمع کیے گئے مختلف اقوال ہیں جنہیں بعد میں ایک کتابی شکل میں مرتب کیا گیا۔

قرآن ایک کتاب نہیں بلکہ ''الکتاب'' ہے یعنی کامل ترین کتاب تمام کتابوں میں صرف قرآن ہی وہ عظیم کتاب ہے جو اپنے تمام پہلوؤں میں مکمل ہے۔ اس کتاب مطلق کے بعد کسی اور وحی کی روز قیامت تک کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ یہ زندگی کے تمام اہم معاملات میں ضروری ہدایات فراہم کرتی ہے۔ اس کی ہمہ گیر ہدایتوں سے انسانی حیات کا ہر گوشہ روشن ومنور ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل کرکے ہی انسان اپنے خالق نیز دوسرے انسانوں سے اپنے تعلقات استوار کرسکتا ہے۔

قرآن کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ ''ذالک'' ایک ایسی ضمیر ہے جو بلندی کے لئے بھی بولی جاتی ہے۔ قرآن کو ''ذالک الکتاب'' یعنی وہ کتاب'' اس لئے کہا گیا ہے تاکہ اس کی اعلیٰ ترین منزلت وعظمت کا اظہار ہو۔ اس کتاب کی عظمت وبزرگی نے اسے ''وہ'' بلندی عطا کی ہے جس کی وجہ سے اسے ''وہ کتاب'' کہا گیا ہے۔ تمام الہامی کتابوں میں سب سے بعد میں نازل ہونے والی یہ کتاب دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ہزاروں لوگ اس کو از اول تا آخر حفظ کرتے اور اپنے قلوب کو منور کرتے ہیں۔

مستند وحی الٰہی:

'ریب' کے معنی شک کے ہیں اور اسے ''باطل'' کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کے جملے ''اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔ کے دو معنی نکلتے ہیں۔ اولاً یہ کہ قرآن بلاشک کلام الٰہی ہے۔ قرآن پہلے مرحلے ہی میں یہ واضح کردینا چاہتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ من جانب اللہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی چکی ہے کہ تمام مذہبی صحیفوں میں صرف قرآن ہی اپنی اصلی شکل میں باقی ہے بقیہ ساری کتابیں جیسے ویدا، اوپنیشد، انجیل، توریت، زبور یا آویستا یا تو امتداد زمانہ سے تلف ہوگئیں یا تحریفات کا شکار ہوکر غیر مستند ہوچکی ہیں۔ ان تحریفات کا اعتراف خود اس کتاب کے ماننے والے بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا سوال ہے تو اس کے سلسلے میں وہ لوگ بھی جو اسے کتاب

الٰہی ماننے پر تیار نہیں ہیں یہی رائے رکھتے ہیں کہ بعینہٖ وہی کتاب ہے جسے پیغمبر محمدؐ نے اپنی امت کے حوالے کیا تھا اور اس میں آج تک کوئی ترمیم یا تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس جملے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کے بے عیب ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی ہدایت کے لئے جو نظام زندگی قرآن پیش کررہا ہے حقیقتاً وہی نظام انسانیت کے لئے مفید ترین اور مستند ہے۔

قرآن کتاب ہدایت:

اب یہ آیت نزول قرآن کی اصل غرض وغایت کی جانب اشارہ کررہی ہے۔ قرآن کریم نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی قصص انبیاء کی۔ یہ نہ تو عقائد کی کتاب ہے اور نہ ہی قانون کی۔ یہ بنیادی طور پر نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ کوئی شاہکار ادب یہ نہ تو مجموعۂ مراسم ہے اور نہ ہی روایات کا ذخیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں مذکورہ بالا تمام باتیں پائی جاتی ہیں مگر ان تمام چیزوں کی حیثیت قرآن کے تعلق سے ضمنی اور ثانوی ہے نہ کہ حقیقی۔ بنیادی طور پر قرآن ایک کتاب ہدایت ہے۔ یہ انسانی حیات کے مختلف زاویوں یعنی جسمانی، روحانی، ذاتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے تمام مراحل کے لئے مکمل ہدایت ہے۔ یہ کتاب انسان کو صراط مستقیم یعنی سچے راستے کی جانب ہدایت کرتی ہے، اور یہ صراط مستقیم عبارت ہے صحت عقاید اور صحت اعمال سے۔ یہ کتاب اہل عرب کے درمیان ایک شاہکار ادب کی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے نزول کا اولین مقصد کاروان انسانیت کو اس کی منزل مقصود کی نشاندہی کرنا تھا۔ ہدایت کے تین مراحل ہیں۔ صحیح راستہ دکھانا، اس کی جانب رہنمائی کرنا، انسان کو منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اللہ کی ہدایت انسان کو رشد وکمال کی منزلیں طے کرنے میں مدد کرتی ہے اور یہ روحانی ارتقاء وپیشرفت موت آجانے کے بعد بھی نہیں رکتی بلکہ آخرت میں بھی جاری وساری رہتی ہے۔

سورۂ فاتحہ میں چونکہ بندۂ مومن اپنے رب کی بارگاہ میں صراط مستقیم کی جانب ہدایت

کرنے کی دعا کرتا ہے اس لئے اس سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں میں ہی اس دعا کے جواب میں خالق اس ہدایت کو پیش کرتا ہے۔یعنی دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو یہ کتاب جو اللہ کی جانب سے کتاب ہدایت بنائی گئی ہے۔ سورۂ حمد کی دعا کی قبولیت کے نتیجے میں ہمارے سامنے ہے۔

قرآنی ہدایت اور تقویٰ کا مفہوم:

قرآن کا یہ اعلان ہے کہ یہ متقین کے لئے ایک ہدایت ہے،یعنی ان حضرات کے لئے جن میں تقویٰ کی صفت پائی جاتی ہے۔

اسلامی طرز فکر کے مطابق خالق کائنات نے انسان کو ذوجہتین قرار دیا یعنی وہ اپنی ایک ذات میں حیوانی اور انسانی وجود ایک ساتھ رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کے دو محور ہیں ایک حیوانیت اور دوسرے انسانیت ۔ مذہب کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند کر کے اعلیٰ انسانی اقدار تک پہنچادے۔مگر انسان کے لئے دوبارہ حیوانیت میں گرنے کا خطرہ ہر وقت لاحق رہے گا۔تقویٰ'' اس صفت کا نام ہے جو انسان کو حوانیت کی تاریکیوں میں گرنے سے بچائے رکھتی ہے۔ اور بلند ترین انسانی صفات تک رسائی حاصل کرنے میں اس کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہے۔تقویٰ یعنی خوف خدا، ایسا خوف جو انسان کو گناہ اور برائی سے باز رکھے۔عربی لغت کے اعتبار سے لفظ متقین کا مادہ ''وقی'' ہے جو حفاظت اور دور رکھنے کے معنی دیتا ہے۔ اس طرح سے متقی وہ انسان کہلائے گا جو ہر وقت گناہوں اور قبیح اعمال سے اپنے نفس کی حفاظت کرے۔یوں تو سرسری طور پر ہمیشہ تقویٰ کا ترجمہ خوف خدا ہی کیا جاتا ہے مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خوف ایک منفی صفت ہے جبکہ تقویٰ نام ہے ایک مثبت فکر وعمل کا۔ تقویٰ اس درخت کا نام ہے جس پر نیک اعمال اور پاکیزگی کے پھل آتے ہیں۔ اسی وجہ سے کچھ مفکرین نے متقی کا ترجمہ پاک خصلت ، خوف الٰہی رکھنے والا، پرہیزگار وغیرہ کیا ہے۔

اوپر دی گئی تمام صفات لفظ تقویٰ میں شامل ہیں۔ یہ مومن کی ایک ایسی سپر ہے جو فطری طور سے اسے ہر رجس وگناہ سے بچاتی ہے، دوسری جانب یہ مشیت الٰہی کے راستے پر

ثابت قدم رہنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ متقین اللہ کے وہ نیک بندے ہیں جن کی زندگی کا محور ذات خدا ہے، اور جو اپنے ارادے واختیار کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں۔ پورے قرآن میں دو الفاظ کی بہت زیادہ تکرار کی گئی ہے۔ اولاً ایمان اور مومنین اور ثانیاً تقویٰ اور متقین۔ ایمان یعنی توحید پر یقین، اس اعتبار سے تقویٰ قلب کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان ہمیشہ تعلیمات اسلام اور روح توحید کے مطابق اعمال انجام دے اور ہر اس فکر یا عمل سے اپنے آپ کو آگاہانہ طور پر دور رکھے جو روح توحید کے منافی ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ کے اس بسیط اور عمیق تصور کو سمجھانے کے لئے اردو زبان کے دامن میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے جو اس مفہوم کو کماحقہ دوسرے کے ذہن تک منتقل کر سکے۔ اسی سے ہم اسلام کی انفرادیت کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں یعنی اسلام صرف مان لینے یا ایمان لے آنے کا نام نہیں ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب ایمان لانے والا اپنے ایمان کا اظہار اعمال کی شکل میں نہ پیش کر دے۔ ایمان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے مگر یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ بندہ اپنے اخلاق وعمل سے اپنے اعمال کی تصدیق کرے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

''متقین کے لئے ہدایت'' کے معنی

اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن تو بنیادی طور پر کل انسانیت کے لئے نازل ہوا ہے مگر اس کتاب ہدایت سے حقیقی استفادہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن میں چند صفات پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے حیوانی وجود سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور خواہشات نفسانی کی اندھی پیروی میں لگے ہوئے ہیں وہ اس کتاب الٰہی سے کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل کرنے کی مطلقاً اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن صرف نیک اور صالح لوگوں کی ہی ہدایت کرتا ہے تو ان لوگوں کا کیا مقدر ہوگا جو ابھی ان صفات تک رسائی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت تو تمام انسانیت کے لئے عام ہے جیسا کہ

متعدد آیات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے (۲۲:۲، ۱۸۶:۲، ۱۳۹:۳، ۴۲:۱۷، ۵۵:۱۸، ۵۹:۳۰) مگر اب یہ انسان کے اوپر ہے کہ وہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں اور قرآن کے مطابق صرف صاحبان تقویٰ ہی اس ہدایت سے کماحقہ مستفید ہوسکتے ہیں۔

نظریۂ علم کی روشنی میں اس جملے کے معنی:

اس جملے سے ہم حصول علم سے متعلق نظریہ میں ایک اہم نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ انسان کی نیت عمل اور اس کے علم میں ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ علم کوئی مادی شئی نہیں ہے جو اپنے منکشف ہونے کا انتظار کرے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی شئی کے بارے میں ایک سرسری سا تعارف اور تصور پیدا کرلیتا ہے لیکن اس شئی کے بارے میں مکمل اور جامع علم حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان اس کے بارے میں کھلے دماغ کے ساتھ تحقیق کرے۔ تحقیق کرتے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا دماغ ایک صفحۂ سادہ کی طرح صاف ہو یعنی پہلے سے ہی وہ کوئی رائے اس شئے کے بارے میں قائم نہ کرے بلکہ یہ دیکھے کہ حقائق اسے کس جانب لے جارہے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ علم ہمیشہ سعی مسلسل کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ پیہم کوششیں کرنے سے انسان اشیاء کی حقیقت اور ان کی فطرت کا ادراک حاصل کرلیتا ہے۔

یہ آیت وحی الٰہی کے سمجھنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ وحی الٰہی کا مکمل ادراک انہیں حضرات کے لئے ممکن ہے جو صحیح فکر ونظریہ رکھتے ہوں۔ اس نظریہ کے بغیر قرآن سے ہدایت حاصل کرنا تو دور کی بات ہے کبھی کبھی اس سے غلط اور گمراہ کن نتائج بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ انسان کو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے سچے محقق کی طرح کھلے دماغ سے اس کی تعلیمات کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ اس طرح اس کا دامن کردار بھی داغدار نہیں ہونا چاہیئے ورنہ دنیاوی ہوا وہوس اس کے فہم وادراک کو متاثر کردیں گی۔

آیت ۲:۳ ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں''

ایمان بالغیب:

درست عقیدہ اور ایمان بالغیب قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی دوسری اہم شرط ہے۔ یہ جملہ بھی اسی نتیجے کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ وحی الٰہی کو سمجھنے اور اس سے مفید ہدایت حاصل کرنے کیلئے انسان کے پاس صحیح فکر اور درست نظریاتی سانچہ (Idealogical Framewa\ork) ہونا کتنا ضروری ہے "الغیب" یعنی نگاہوں سے اوجھل یا ماورائے حواس۔ یہ لفظ ان تمام حقیقتوں کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کا ادراک حواس کے حدود سے بالاتر ہو یا جو کسی خاص وقت میں انسان کی نگاہوں سے غائب ہو۔ یہ ایک نسبی اصطلاح ہے، کوئی شئی جو آج ہمارے لئے غیب کا درجہ رکھتی ہے کل عالم شہود میں شمار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی شئی جو عوام الناس کے لئے غیب ہے، اہل علم وفضل کے لئے شہود کی منزلوں میں ہو سکتی ہے۔ مگر کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو تمام عالم انسانیت کے فہم و حواس کی گرفت سے باہر ہیں اور انہیں حقائق کو ہم غیب مطلق کہتے ہیں۔

ایمان بالغیب سے مراد ماورائے حواس حقیقتوں کے وجود پر ایمان ہے۔ ذات الٰہی ،ملائکہ اور یوم آخرت عالم غیب سے متعلق ہے۔ خالق کائنات کے وجود پر ایمان روحانی ارتقاء کی پہلی شرط ہے اور اللہ "غیب مطلق" ہے۔ اسی طرح آخرت کے حقائق عالم ارواح ، حیات بعد الموت، جنت اور جہنم، روز قیامت وغیرہ عالم غیب کے حدود میں آتے ہیں۔ اہلبیت اطہار علیہم السلام کی چند احادیث کے مطابق اس آیت میں لفظ "غیب" سے مراد بارہویں امام حضرت حجۃ ابن الحسن علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرت آج بھی زندہ ہیں مگر لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اس نظریہ کا مندرجہ بالا باتوں سے کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت حجت کی غیبت بھی عالم غیب ہی کا ایک پہلو ہے۔

تمام مذاہب عالم اس بات پر متفق ہیں اور اسی نقطے سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں کہ اس عالم رنگ وبو سے مافوق ایک دنیائے غیب بھی موجود ہے۔ درحقیقت ایمان بالغیب

ہی دین کی شناخت اور اس کی اساس ہے، جو اس پر ایمان نہ لائے وہ حقیقتاً دین ہی کا انکار کرتا ہے۔ اگر ہم ایک وسیع معنی میں دین کی تعریف کرنا چاہیں تو وہ یہی ہوگی کہ دین سے مراد غیب پر ایمان رکھنا ہے۔

یہاں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ غیب پر ایمان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خیالی اور غیر حقیقی اشیاء پر ایمان رکھا جائے۔ روح قرآن اس سے زیادہ بعید کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ قرآن مسلمانوں سے ایسے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا عقل وفہم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ قرآن در اصل ایسے ایمان کو ایمان ہی ماننے پر تیار نہیں ہے جسے عقل وخرد کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے۔ (ملاحظہ ہو آیات ۵۳:۵۳، ۵:۱۶۴، ۳۶:۳۰۴، ۶:۱۴۹۴، ۲۵:۷۴) متعصب ناقدین کے اس اعتراض میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے کہ قرآن غیر عقلی باتوں پر ایمان کا حکم دیتا ہے، تعصب کے پردوں کی وجہ سے یہ حضرات لفظ ایمان کے حقیقی معنی سے بے خبر ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کو ایسے کسی غیب پر ایمان رکھنے کا حکم نہیں دیتا جو دائرہ عقل سے خارج ہو۔ اس کائنات میں نہ جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں کہ حواس کی گرفت سے آزاد ہونے کے باوجود ان کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ ذات باری تعالیٰ اپنے کمال مطلق اور لامحدود ہونے کی وجہ سے ہمارے محدود حواس وشعور کی گرفت سے باہر ہے اسی طرح ملائکہ اور آخرت کی ابدی حیات بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف دکھائی نہ دینے کی وجہ سے ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ اگر ہمارے حواس کسی حقیقت کو محسوس نہ کرسکیں تو کیا اس حقیقت کے وجود ہی کا سرے سے انکار کردیا جائے؟ اس طرح یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، جیسا کہ کچھ عیسائی مفسرین کا الزام ہے، کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر مبہم اور غیر عقلی باتوں کو ایمان کے نام پر تھوپنا چاہتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ عیسائیت کا دامن خود اس مقام پر داغدار نظر آتا ہے، اور یہ خود اپنے ماننے والوں سے غیر عقلی عقائد (جیسے تثلیث) کو ماننے کا اصرار کرتی ہے۔

اس جملے ''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں'' کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مومنین اپنے تمام فرائض اور عبادات کو بغیر کسی مادی لالچ کے خلوص دل کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور ان کی راہ میں آنے والی تمام مشکلات کو کمال صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں ان اعمال صالحہ کی انجام دہی میں یہ حضرات قربانیاں بھی پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے سامنے کوئی ظاہری انعام یا جزا کا تصور نہیں ہوتا۔

اگر انسان کے پاس درست نظریہ نہ ہو اور وہ محسوسات کی دنیا سے بلند ہونے پر تیار نہ ہو تو یقیناً وہ وحی الٰہی سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

''... اور نماز قائم کرتے ہیں''

مذہب صرف جاننے کا نہیں بلکہ جانکر عمل پیرا ہونے کا نام ہے:

یہ قرآن فہمی کی تیسری شرط ہے اور یہی متقین کی تیسری علامت ہے۔ قرآن سے حقیقی ہدایت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے عقاید کے عملی اظہار کے لئے حکم خدا کے سامنے سراپا اطاعت بن جائے۔ اسی راہ بندگی کے پہلے قدم کا نام ''صلوٰۃ'' ہے یعنی متقین وہ ہیں جو نمازیں ادا کرتے ہیں اور انہیں قائم کرنے میں ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ اسلامی طرز فکر کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ یہاں علم کے ساتھ عمل کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر انسان کا عمل اس کے علم کا ساتھ نہ دے سکے تو اس کا علم ادھورا ہی سمجھا جائے گا۔ صرف دین کی معرفت حاصل کرلینے بھر سے انسان کا شمار دینداروں میں نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ میدان عمل میں اپنے ایمان کے خلوص اور اپنی معرفت کی صداقت کا ثبوت نہ دے دے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کی فکر اس سانچے میں نہ ڈھلے گی اسوقت تک قرآن سے سچی ہدایت حاصل کرنا اس کے لئے دشوار ہوگا۔ اس نظریہ کے برعکس دنیا کے کچھ مذاہب صرف ایمان اور عقائد کے اقرار کرلینے ہی کو انسان کے لئے کافی قرار دیتے ہیں اور اس سے کسی عمل صالح کا مطالبہ نہیں کرتے (مثال کے طور پر عیسائیت اپنے معتقدین سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تم حضرت

عیسیٰ مسیح کو فرزند خداوند تسلیم کرو اور ان کو اپنا نجات دھندہ سمجھو اس کے بعد تمہیں کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب تمہاری بخشش کے لئے حضرت مسیح ذمہ دار ہیں)

اسلام اس نظریہ کی سرے سے نفی کرتا ہے اور اپنے پیغام کی ابتداء ہی سے یہ صاف کردینا چاہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں عملی سرگرمی دکھائے بغیر صرف عقیدے کی بنیاد پر انسان قرآن کی ہدایت کا حقدار نہیں بن سکتا۔

نماز کے معنی اور اس کی اہمیت (یومیہ نمازیں)

نماز کے لغوی معنی دعا کے ہیں۔ نماز اس عبادت کا نام ہے جسے مسلمانوں پر دن میں پانچ وقت واجب کیا گیا ہے۔ اسلام میں نماز ایک مستقل عبادت ہے جسے ایک خاص شکل عطا کی گئی ہے اور اسے دین کا ایک اہم جز قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں "صلوٰۃ" ان تمام اعمال کا ایک علامتی نام ہے جو انسان خدا کی راہ میں انجام دیتا ہے۔ یہ در اصل اس رشتے کا نام ہے جو بندے کو اپنے معبود سے منسلک کردیتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام سماجی، سیاسی، اور ذاتی مراحل میں اپنے خالق کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اسی لئے ترک نماز کو معبود کی نافرمانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ منطقی طور پر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک طرف تو انسان اپنے خالق کی محبت اور اس کی اطاعت کا دم بھرے اور دوسری جانب اس محبت کے عملی اظہار میں پہلو تہی کرے۔ شاید یہی عبادت کا اصل مفہوم ہے کہ انسان اپنے جذبۂ عبدیت کو عمل کا لباس پہنا کر اسے منزل کمال تک پہنچادے۔

نماز ادا کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ نبی کریمؐ اور آئمہ طاہرین نے تاکید فرمائی ہے۔ آٹھویں امام علی رضا علیہ السلام نے محمد ابن سنان کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ نماز اس لئے بہت اہم ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بزرگی کا اقرار اور ہر طرح کے شرک کا انکار ہے۔ نماز میں خداوند کریم کے حضور کھڑا ہونے کا احساس ایک بندہ مومن کے لئے

گناہوں سے اجتناب کا باعث ہوتا ہے اور ہر طرح کی برائی اور بدعنوانی کے مقابلے میں انسان کے لئے ایک سپر کا کام کرتی ہے۔

بعض حضرات عبادات کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب سوائے رسم کے اور کچھ نہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ عبادت کا سیدھا تعلق انسان کی عقل وروح سے ہے لہذا اس میں کسی جسمانی عمل کو انجام دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر انسان کا دماغ سرکشی کی جانب مائل ہوتو جسم کا سجدہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسان اپنے خالق اور اپنے دین کے لئے سنجیدہ نہیں ہے اور روح مذہب سے آشنا نہیں ہے اور اس کے بعد بھی وہ عبادتیں انجام دیتا ہے تو یہ ریاکاری ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی منافقت ہے کہ انسان پہلے ایک دین اور طرز زندگی کو تو تسلیم کرے مگر اپنے اعضاء جسم اور اپنے اخلاق سے اس کا اظہار نہ کرے۔ خالق کی اطاعت کی ایک علامت ہونے کے علاوہ نماز انسان کی روح کو پاک وپاکیزہ بنانے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔قرآن بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ نماز کا مقصد لوگوں کے قلوب کو پاک کرنا ہے۔ (۲۹:۴۵) نماز کے ذریعے انسان کے قلب پر اللہ سے تعلق کا جو ایک دیرپا اثر قائم ہوتا ہے وہی دراصل پاکیزگی قلب وروح کا موجب ہے۔

قیام نماز ادائے نماز سے اہم ہے۔

صرف نماز کو ادا کردینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے لئے مسلسل سعی کرنا بھی لازم ہے۔ نماز کا قیام خلوص دل کے ساتھ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہونا چاہیئے۔ ''یقیمون'' لفظ ''اقام'' سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی شئی کے قیام یا اس کے اہتمام و کمال انجام دینے کے ہیں۔ یقیمون یعنی وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں،اس کے ممکنہ معنیٰ اولاً تو یہ ہوسکتے ہیں کہ ایک مسلمان کو اپنی پوری زندگی میں نمازوں کو ادا کرنا چاہئے ثانیاً یہ کہ اسے نمازوں کو اپنے وقت معینہ پر ادا کرنا چاہیئے ثالثاً یہ کہ اسے اپنی نمازوں کو خلوص دل اور روح نماز کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح اس کا ایک مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو نماز

ہمیشہ باجماعت ادا کرنا چاہیے جیسا کہ اسی سورے کی ۴۳ ویں آیت میں حکم دیا گیا ہے اور آخر میں یہ کہ انسان کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی نماز کی جانب رغبت دلانی چاہیے۔ پورے قرآن میں ہر مقام پر لفظ صلوۃ کے ساتھ ''اقام'' (یعنی قائم کرنا) کا استعمال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قیام نماز، ادائے نماز سے زیادہ اہم اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ ''یقیمون الصّلوۃ'' کے سبھی پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس جملے کی تکرار اور تاکید کے پیچھے قرآن کا مقصد کیا ہے۔

''اور اس میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے''

اللہ کی راہ میں مال کی قربانی:

متقین کی جماعت میں شامل ہونے کی یہ ایک اور شرط ہے۔ جب بندۂ مومن کا ایک گہرا تعلق اپنے خالق سے قائم ہوجاتا ہے تو اس کے دل کے کسی کونے میں خدمت خلق کا جذبہ بھی انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی یہی چوتھی شرط ہے یعنی انسان راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنے کو تیار ہوجائے، یہ انفاق درحقیقت انسان کے قرار بندگی کی تصدیق ہے۔ اپنے مال کو فی سبیل اللہ قربان کرکے انسان یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ دولت کا پجاری نہیں بلکہ مرضی خدا کا پابند ہے۔ اس طرح جذبۂ عبدیت کی تکمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ انسان اپنے عقیدے اور نظریہ کے لئے مال خرچ کرنے پر راضی ہوجائے۔

آیت کے اس جملے کا اولین اور وسیع ترین مفہوم یہی ہے کہ انسان خدا کی راہ میں خیرات کرے۔ دولت، طاقت، رسوخ، جسمانی، اور ذہنی صلاحتیں غرض کہ ہر وہ نعمت جو انسان اللہ کی طرف سے حاصل کرتا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جانا چاہیے۔ قرآن کے مطابق تمام مادی اور روحانی نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اصطلاحی نام انفاق ہے۔

اس طرح اہل تقویٰ وہ حضرات ہیں جو نہ صرف اپنے مادی وسائل بلکہ اپنی روحانی اور ذہنی قوتیں جیسے علم، سائنس، ذہانت وغیرہ کو بھی خالق کائنات کی راہ میں قربان کرنے کے

لئے تیار رہتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں انفاق کرنا نہ صرف انسانی سماج کی بہتری اور ارتقاء کی ضمانت ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے نفس کی چند بیماریوں جیسے دنیا پرستی اور بخل وکنجوسی سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے۔ یقیناً یہی وہ صفت ہے جو اس دنیا کو جنگ وجدل کی دنیا نہیں بلکہ انسانیت اور تہذیب کی دنیا بناسکتی ہے۔ یہ آیہ کریمہ مسلمانوں کے لئے دو طرح کے فرائض کا اعلان کرتی ہے اولاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت اور ثانیاً خدمت خلق۔ ان دونوں فرائض کا بیان اس لئے کیا گیا ہے تاکہ انسان کے عقائد کا انعکاس میدان عمل میں نمایاں ہوسکے۔